دور اندیش

اور

صاحبِ نظر کون تھا؟

مدارس اسلامیہ کے موجودہ نصاب و نظام تعلیم پر ایک تحریر

مولانا محمد معاویہ سعدی

استاذ شعبۂ تخصص فی الحدیث مظاہر علوم سہارنپور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے مدارسِ اسلامیہ کے نصاب ونظام پر ''عصر حاضر''، اور ''موجودہ حالات'' کے تقاضوں وغیرہ، کے عنوان سے مختلف قسم کے اعتراضات کا سلسلہ، گذشتہ ڈیڑھ صدی سے جاری ہے، جب دیوبند میں اکابر دیوبند نے عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی جب ہی کسی لکھنے والے نے لکھا تھا:

۱ـــ ''جب مسلمانوں میں کچھ تعلیم کی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اس بات پر مقصود ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقہ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درسِ کتب کا اختیار کیا جاتا ہے، چنانچہ اس زمانے میں اسی پرانے طریقے پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لیے جاری کیے ہیں''۔

۲ـــ ''.... دیوبند کے مدرسے کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، افتخار العلماء، وفخر الکملاء، امام اعظم عہد، شیخ زماں وصاحبینِ دوراں مدرس ومہتمم ہیں، پھر سہارنپور، انبہٹہ میں مدارسِ اسلامی موجود ہیں، غرض کہ بہت سی جگہ مدارس جاری ہیں، قطع نظر اس بحث کے کہ یہ کام قوم کو مفید ہیں اور قوم کو اس کی ضرورت ہے، یا اس سے زیادہ اور چیزوں کی ضرورت ہے....''۔

۳ـــ ''مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات سمائی ہے کہ علمی عبادت صرف علومِ دینیہ ہی کے پڑھنے پر منحصر ہے، اور اس کے سوا کسی علم کا پڑھنا یا پڑھانا، یا اُس پر روپیہ خرچ کرنا داخلِ عبادت نہیں، اور اسی لیے ثواب بھی نہیں۔ ان میں یہ مثل مشہور چلی آتی ہے کہ:

علم دیں فقہ است وتفسیر وحدیث ہر کہ خواند غیر ازیں گردد خبیث

اور لکھنے والے یہ بھی لکھ رہے تھے:

۴ـــ ''حالات کا تقاضہ، خطرات کی پے درپے بجنے والی صدائے جرس، ''قدیم مدارس'' میں کوئی بیداری، جنبش اور حرکت نہیں پیدا کرسکی، قدیم عربی مدارس کتاب وسنت پر استقامت اور صلابت کے

طریقۂ تعلیم پر اصرار کی قابلِ قدر کوشش کے ساتھ، نئے مسائل پر توجہ اور نئے سوالات کے جواب کی فکر کما حقہ نہ کر سکے، انھوں نے اقدامی پوزیشن کے بجائے دفاعی پوزیشن پر قناعت کر لی“۔

یہ بھی ارشاد ہو رہا تھا:

۵— ”علوم اسلامیہ کا قدیم نصابِ تعلیم اس زمانہ میں تو برابر بدلتا اور زندگی کا ساتھ دیتا رہا جس میں انقلابات بہت دیر میں آتے تھے، اور ان کی نوعیت میں بنیادی فرق نہیں ہوتا تھا، یہ انقلابات اشخاص اور حکمراں خاندانوں کی تبدیلی کا نام تھے، لیکن اس کے باوجود واضعینِ نصاب اور عالمِ اسلام میں علمی و تعلیمی تحریک کے رہنما برابر اپنی ذہانت وحقیقت پسندی کا ثبوت دیتے رہے، اور تبدیلی واضافہ سے کام لیتے رہے، لیکن جب انیسویں صدی کا وہ زمانہ آیا جس میں حکمراں خاندانوں کا نہیں، بلکہ تہذیبوں اور اَفکار و اَقدار کا انقلاب رونما ہوا، اور انقلابات کی کثرت اور شدت دونوں حد سے متجاوز ہو گئیں، تو ”یہ نصاب ایک منزل پر آ کر ٹھہر گیا، اور اس نے ہر تغیر واضافہ سے انکار کر دیا، مضامین، مقررہ کتابوں اور طرزِ تعلیم، ہر چیز میں اس روش پر اصرار کیا گیا جو ہندوستان میں بانئ درس نظامی (ملا نظام الدین لکھنوی ۱۱۶۱ھ) اور مشرقِ وسطیٰ میں اٹھارہویں صدی کے علمائے ازہر کے زمانہ میں قائم ہو گئی تھی ...“۔

حالاں کہ اِس اقتباس میں دیگر تاریخی اور واقعاتی خدشات کے ساتھ ساتھ، ایک بڑا اِشکال یہ بھی ہے کہ اگر ”نصابِ تعلیم“ ایسی ہی کوئی مؤثر شے تھی، اور اُسی پر قوموں کا عروج وزوال منحصر تھا، تو پھر ماضی کے اُس مزعومہ زندہ اور متحرک نصاب کے ہوتے ہوئے، مسلمانوں کی قوت وشوکت اور حکومت وسلطنت جاتی کیوں رہی؟! اور پہلی مرتبہ جو قوت وشوکت حاصل ہوئی تھی اُس میں کون سا نصاب ونظام اثر انداز ہوا تھا؟!

۶— ”اِس نصاب میں قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اور تحصیل فن کی طرف توجہ کم کی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ طلباء میں ضرورت سے زیادہ احتمال آفرینی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن کسی فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا“۔

دیوبند اور اُس کے ہم فکر دینی مدارس کے سلسلے میں یہ، اور اِس طرح کے اور بھی نہ جانے ”جمود“، ”تعطل“، ”روایت پرستی“، ”قدامت پسندی“، ”کاہلی“، ”تعصب“، ”تنگ نظری“ وغیرہ

کے کیسے کیسے طعنے اور کیسی کیسی چٹکیاں اُس وقت کی ''متمدن'' تاریخوں میں محفوظ ہیں۔

مگر راستے کے اِن شور ہنگاموں اور اِدھر اُدھر کے دیگر اور بہت سارے مشوروں، تبصروں اور اعتراضات سے بے نیاز، کچھ اللہ والے اخلاص وللٰہیت اور تواضع وفنائیت کے دوش پر سوار، صرف اور صرف ''فلاحِ آخرت کی فکر'' اور ''دین کی (اُس کی اصل شکل میں) حفاظت'' کا عنوان لے کر، مساجد، مکاتب اور قدیم طرز کے مدارس کے تنگ وتاریک حجروں میں بیٹھ کر ''قال اللہ وقال الرسول'' کی رٹ لگانے میں مشغول ہوگئے۔

حالاتِ زمانہ سے نمٹنے اور اصلاح حال کی کوششوں کے پس منظر میں اُن کے سامنے صرف اپنے عقلی منصوبے اور ریاضی اور سائنس سے لگائے ہوئے تخمینے نہیں تھے، بلکہ آخر زمانہ سے متعلق وارِد وہ بہت ساری نصوص بھی تھیں جن سے اِن حالات کے لیے شرعی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، اُن کے پیشِ نظر آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اِرشاد گرامی بطور خاص تھا: **بدأ الإسلام غريباً، وسيعود كما بدأ غريباً، فطوبى للغرباء** (مسلم: ۱۴۵)۔

اِعجاب كل ذي رأي برأيه (خود رائی اور خود پسندی) کے اِس دور کے لیے وہ حدیث بھی سرمۂ بصیرت بنی ہوئی تھی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق وباطل کے خلط کے زمانے (اور دجالی دور) کے لیے یہ ہدایت فرما رکھی تھی: **قلت: فإن لم يكن لهم جماعة ولا إمام؟ قال: فاعتزل تلك الفرق كلها، ولو أن تعض بأصل شجرة، حتى يدركك الموت وأنت على ذلك** (البخاری: ۳۶۰۶، ومسلم: ۱۸۴۷)۔

(کہ جب کوئی خلافت اور مرکزیت باقی نہ رہ جائے تو تمام جماعتوں سے الگ ہوکر، یکسو ہوجاؤ۔ اور ایک اور حدیث میں ہے کہ ایسے میں بس اپنی فکر کرو)

اُن حضرات کے لیے اپنا نصاب ونظام تشکیل دیتے ہوئے، اور اُس کا بنیادی مقصد طے کرتے ہوئے یہ حدیث بھی رہنما کی حیثیت سے موجود تھی: **يحمل هذا العلم من كل خلف عدوله، ينفون عنه تحريف الغالين، وتأويل الجاهلين، وانتحال المبطلين.** (شرح مشکل الآثار: ۳۸۸۴،

ومسند البزار: ۹۴۲۳، والحديث بمجموع طرقه حسن)۔

اِس حدیث کا مضمون یہ ہے کہ: ایک تو علم دین کے حاملین: ثقہ اور عادل قسم کے لوگ ہوں، آزادروش اور غیر متقی نہ ہوں۔ دوسرے اُن کا خاص موضوع، اور محورِ فکر: اِحقاقِ حق اور اِبطالِ باطل کے ذریعے حفاظتِ دین ہو۔

ہمارے اکابر کے پیشِ نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی سیرت بھی تھی، جہاں صرف اِیمان پر استقامت، صبر وتقوی کی عادت، اخلاق کی اصلاح، عبادات پر مداومت، اور معاشرت ومعاملات کی صفائی کے اہتمام پر توجہ تھی۔

اور جیسے جیسے وقت کی سوئی آگے بڑھتی رہی، حالات اور زمانہ خود شہادت دیتے رہے کہ فیصلہ کس کا درست تھا؟ دور اندیش اور صاحبِ نظر کون تھا؟ بلند پروازی اور فراستِ ایمانی کس کے ہاں تھی؟ ہمدردِ قوم اور بہی خواہِ ملت کون سے طبقات اور افراد تھے؟ کن کے ہاں صرف بلند وبانگ نعرے اور دعوے تھے؟ اور کون لوگ قدیم طرز کے چراغوں کا دھواں پھانک پھانک کر، قوم کو موجودہ پستی اور زبوں حالی سے نکالنے کی علمی، فکری اور عملی کوششوں میں مصروف تھے؟

کون ''احتمال آفرینی'' کی صلاحیتوں کو کام میں لا کر قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم پر دادِ تحقیق دے رہا تھا، اور اِس زمانے میں بھی امت کے لیے خالص دینی وشرعی رہنمائی کا سامان کر رہا تھا؟ کون برصغیر کے چپے چپے پر، گاؤں گاؤں میں دینی مکاتب اور اسلامی مدارس کے قیام کے لیے کوشاں اور سرگرم عمل تھا؟ کون دعوت کے میدان میں مشرق ومغرب کے فاصلے سمیٹ رہا تھا، اور بر وبحر کے فرق وامتیاز کو زیر وزبر کر رہا تھا؟ کون تھا جس کے ردّ رسوم وبدعات کے تجدیدی کارناموں، اور اصلاحی کوششوں کو وقت کا مؤرخ سنہری حروف سے لکھنے پر مجبور تھا؟ کون معرکۂ جہاد میں شاملی کے میدان سے لے کر، افغانستان کے کہساروں تک کو گرما رہا تھا؟ کون ایوانِ سیاست میں پوری قوم کی نمائندگی کر رہا تھا؟ ۱۹۴۷ء کے خوں چکاں حالات میں کون تھا جو مسلمانوں کو تسلی دے

رہا تھا، اُن کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا؟ .....وغیرہ وغیرہ۔

وہ کون سے علمی وعملی ''آستانے'' تھے جہاں بڑے بڑے دستار اور عمامے زمیں ریز ہو رہے تھے؟ رشد وہدایت کی وہ کون سی ''خانقاہیں'' تھیں جہاں ''قدیم وجدید'' سب آ کر باہم آمیز ہو رہے تھے؟ وہ کون سے تحقیقی اور فقہی مراکز تھے جہاں جدید سے جدید مسائل، اور اسلام پر پڑنے والے نئے سے نئے شبہات واعتراضات حل کیے جا رہے تھے؟ **فھل من مبارز؟**

غور کرنے کی بات ہے کہ جن افراد اور طبقات نے دیو بند وسہارنپور کے نصاب ونظام پر ہمیشہ جارحانہ تنقیدیں کیں، اور نشانۂ ملامت بنایا، اُسی صف کا ایک مشہور مؤرخ یہ شہادت دینے پر کیوں مجبور ہوا؟:

''دارالعلوم دیو بند کی ابتداء نہایت معمولی تھی، لیکن اللہ کے کرم، اور بانیوں کے حسنِ نیت سے جلد ہی اُس نے ترقی شروع کر دی، مولانا محمد قاسم نے شروع ہی سے اسے اپنی سرپرستی میں لیا، اس کے علاوہ مولانا محمد یعقوب کو اس مدرسے کی توسیع میں بڑا دخل ہے...، دیو بند کا قیام جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بیس پچیس سال بعد ہوا (بلکہ صرف دس سال بعد)، لیکن جلد ہی اُس نے قوم کے تعلیمی نظام میں معزز جگہ حاصل کر لی، اور آج قدیم طرز کی اسلامی درسگاہوں میں سب سے اہم گنا جاتا ہے، اس کی ترقی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کا بیج اچھا تھا، اور اچھے ہاتھوں سے بویا گیا تھا...، گذشتہ پچاس سال کے حالات دیکھتے ہوئے یہ کہنا قطعاً مبالغہ نہیں کہ دیو بند نے قوم قوم کی بڑی مذہبی اور علمی خدمت کی ہے... دیو بند کا پیمانہ بہت وسیع ہے، وہاں سے ہزاروں علماء اور طلبہ فارغ التحصیل ہو کر نکلے ہیں، انھوں نے ملک ملک کے کونے کونے میں اسلامی علوم کے چراغ روشن کیے، مذہب کی اشاعت کی، بدعتوں اور مضر اخلاق خرابیوں کی اصلاح کی...، دارالعلوم دیو بند نے بغیر کسی شور وغل کے، تھوڑی ہی مدت میں جو اعتبار ومرتبہ حاصل کر لیا ہے، وہ اس کے منتظمین کی قابلیت اور نیک نیتی کا واضح ثبوت ہے، اور انھیں اس پر فخر کا جائز حق ہے...''۔ (ملتقطاً از: موج کوثر، شیخ محمد اکرام علیگ)۔

ایک اور معروف فکری ترجمان کس چیز سے مجبور ہو کر یہ اعتراف فرماتے ہیں؟:

''پھر یہ بھی ایک حقیقت کہ ملت کی قیادت اور دینی رہبری کے لیے ''تحریکِ دیوبند'' نے جیسی قدآور، عظیم اور مقبول خاص وعام شخصیات پیش کیں ''تحریک ..... ''ایسی شخصیات نہیں پیش کرسکی'' (ہمارا نصابِ تعلیم ص ۱۸۸)۔

غبارِ رہ گذر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

مگر ہماری تاریخ کا یہی وہ مقامِ عبرت بھی ہے کہ جب تک دیوبند وسہارنپور کے یہ بوریہ نشین، قدیم طرز کے پڑھے ہوئے یہ قدامت پسند مولوی، ہر طرح کے اعتراضات اور ملامتوں سے یکسو، صرف اور صرف اپنے موروثی نصاب ونظام سے وابستہ رہے، اُس وقت تک ملکی ہی نہیں، بلکہ عالمی منظر نامے پر بھی، پوری ملت اسلامیہ کی امیدوں کا واحد مرکز، تن تنہا یہی حضرات اور یہی افراد رہے، اور جیسے جیسے ''حالاتِ زمانہ'' کی رعایت اور ''عصری تقاضوں'' کی مروت میں بزرگوں کے وضع کردہ اِس ''مبارک نصاب ونظام'' سے چھیڑ چھاڑ کی گئی، ہماری وہ امتیازی شؤون جاتی رہیں جن کی بنا پر قیادت وسیادت کا مرتبۂ بلند حاصل تھا، اور ہم بھی آہستہ آہستہ اسی بھیڑ میں گم ہوتے چلے گئے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ اپنے ایک مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

''پیارے تقی! کیا کیا لکھواؤں؟ ہمارے اکابر جنھوں نے دار العلوم ومظاہر علوم کی بنیاد رکھی تھی، اُن کا اِخلاص اور مکارِم اخلاق اور محاسن افعال اور شریعت وطریقت کی جامعیت عجیب چیزیں تھیں، یہ حضرات ہر علم سے واقف، معقولات اور منقولات کے سمندر کے شناور، اور ساتھ ہی بے نفسی، تواضع اور فنائیت کے مجسمے تھے، سب کچھ ہوتے ہوئے، اپنے نزدیک کچھ بھی نہ تھے۔

اہل سنت والجماعت کے مسلک سے یکسر ہٹنا اُن کو گوارا نہ تھا، فقہِ حنفی کے مضبوطی سے مقلد تھے، اور عدم تقلید کو گمراہی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے، تمام ائمۂ حدیث وفقہ کا پورا پورا احترام کرتے تھے، ان کے دل وزبان ہمیشہ ذکر اللہ سے معمور رہتے تھے، ایک وہ زمانہ تھا کہ دونوں مدرسوں (دار العلوم، مظاہر علوم) میں دربان سے لے کر صدر مدرس ومہتمم تک ہر

شخص صاحب نسبت ہوتا تھا''۔

اس کے بعد دور بدل جانے کی شکایت اور حسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آج میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ امتیازی شؤون مٹ رہی ہیں جو اپنے اکابر کا طرۂ امتیاز تھیں، اکابر ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں، اور اصاغر ان کی جگہ تو لے رہے ہیں لیکن علوم واعمال اور اذکار میں ان کے قائم مقام نہیں بن رہے ہیں، صرف رسمیہ الفاظ اور شاعرانہ قسم کے مضامین کی بہتات رہ گئی ہے'' (اقتباس مکتوب، از: مدینہ منورہ ۹ رشعبان ۱۳۹۸ھ، البلاغ، خصوصی اشاعت کراچی، ۱/ ۲۶)

اِس لیے کہ انگریزی استعمار کی طرف سے مسلط کی گئی جنگ دراصل تہذیبوں اور اقدار کی جنگ تھی، قدیم وجدید اور مشرق ومغرب کی کشمکش تھی، اِیمان ومادیت کا معرکہ اور دین ودنیا کی آویزش تھی، مغرب کی اِس علمی، فکری اور تہذیبی یلغار میں ہتھیار اور ٹیکنالوجی کا اِستعمال کم، اور نفسیات واعصاب پر قابو رکھنا زیادہ اہم تھا، اپنی قدیم تہذیب، پرانی قدروں پر صبر واستقامت ہی اِس جنگ میں کلید کامیابی اور نوید فتح تھی۔

سو جن طبقات وافراد نے یہ صبر واستقامت دکھائی، اُن کو لوگوں کے قلوب پر حکومتیں عطا کی گئیں: **وجعلناهم أئمة يهدون بأمرنا لما صبروا، وكانوا بآياتنا يوقنون (الٓمٓ السجدة: ۲۴)** (اور جب اُنھوں نے صبر واستقامت سے کام لیا تو ہم نے اُن میں سے کچھ لوگوں کو امام ومقتدا بنادیا، جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں، اور وہ ہماری آیتوں پر یقین بھی رکھتے تھے)

اور جو لوگ ''مزعومہ عصری تقاضوں'' سے متاثر ہوئے، تو پھر وہ تہذیبِ نو کے تند وتیز حملوں سے خود کو پوری طرح سے محفوظ نہ رکھ سکے (الا ماشاء اللہ)، ''تاریخی حقائق'' اِس دعوے پر شاہد عدل ہیں۔

گذشتہ سطور میں مدارسِ اسلامیہ کے نصاب ونظام پر ''عصر حاضر''، اور ''موجودہ حالات'' کے حوالے سے کیے جانے والے مختلف قسم کے اعتراضات کے چند نمونے پیش کیے گئے

تھے، اور یہ عرض کیا گیا تھا کہ یہ سب اشکالات: مدارسِ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد نہ سمجھنے، اور اُن کا استحضار نہ رکھنے سے پیش آتے ہیں۔

ہمارے اِن مدارس کا بنیادی مقصد ہے: دین کی اُس کی اصل شکل میں، معہود ومتوارث طریقے پر حفاظت، اور قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم کے ذریعے: مکمل دین کی تبلیغ واشاعت۔

اِس سلسلہ میں سب سے پہلے ''فکر دیوبند'' کے عظیم شارح اور ترجمان حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے چند ارشادات پیش خدمت ہیں:

۱- ''حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ نے جلسہء دستار بندی میں فرمایا تھا کہ اکثر لوگوں کو اس مدرسے کی حالت دیکھ کر خیال ہوگا کہ یہاں علوم معاش کا کچھ انتظام نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مدرسہ اس لیے ہے ہی نہیں، نہ ہم نے دعویٰ کیا ہے کہ تمام علوم کی تعلیم ہوگی، یہ تو صرف ان کے لیے ہے جن کو فکر آخرت نے دیوانہ بنایا ہے''۔ (حسن العزیز ج دوم ص ۱۳۹)

۲- ''مسلمانوں کو اِس وقت، بلکہ ہر وقت جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ اُن کے دین کی حفاظت ہے، اور دنیا کی صرف اُتنے حصے کی جس کو دین کی حفاظت میں دخل ہو'' (مستفاد از: امداد الفتاوی ۶/۲۳۰، ماخوذ از ''بدلتے حالات میں مدارس کی ترجیحات'')

۳- ندوہ کے ابتدائی زمانۂ قیام میں حضرتؒ کی اہل ندوہ سے، اٹھارہ صفحات پر مشتمل ایک طویل مکاتبت ہوئی تھی، جو ''اِمداد الفتاوی'' حوالۂ بالا میں درج ہے، اہل علم کے لیے قابل ملاحظہ ہے، اُس میں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اکابر ندوہ نے اپنے جو منشور ومقاصد حضرت تھانویؒ کی خدمت میں برائے ملاحظہ اِرسال فرمائے تھے، اُن پر حضرت نے بار بار یہ سوال قائم فرمایا ہے کہ ''اِس چیز کو حفاظتِ دین میں کیا اور کتنا دخل ہے؟''۔

واضح رہے کہ دین ودنیا کے دو مختلف راستوں، اور ایسے ہی اہل حق اور اہل باطل کے دو مختلف طبقات کے درمیان فاصلہ باقی رکھنا: ''حفاظتِ دین اور حفاظتِ حق'' کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا تھا۔ اور یہی وہ بنیادی نقطہ اور مابہ الفرق ہے جو ''فکر دیوبند'' کو دیگر تمام علمی وفکری سلسلوں سے ممتاز کرتا ہے۔

۴— حضرت کو لکھا گیا تھا کہ ''قدیم تعلیم اول تو چراغ سحری ہے، دوسرے وہ اِس قدر تنگ دائرے میں محدود ہوگئی ہے کہ اس سے اس قسم کے اغراض (جن کی طرف اصل خط میں صرف اشارہ کیا گیا تھا) حاصل ہونے کی توقع نہیں ہوسکتی''۔

اِس پر حضرتؒ نے فرمایا: ''...... کاش اگر وہ اغراض متعین ہوتیں تو ہر مسلمان اس میں غور کرسکتا ہے کہ آیا تعلیم قدیم سے یہ غرض حاصل نہیں ہوسکتی، یا کوئی خفیف سی کمی ہے جس کا بہت تھوڑی ترمیم یا اضافہ سے تدارک ہوسکتا ہے، وہی اِبہام یہاں بھی ہے۔

دوسرا نقص دکھلایا ہے کہ اس میں علمی ''بلند نظری'' نہیں پیدا ہوتی، بلند نظری کی مطلق شرح نہیں کی، تعلیم اسلامی سے جو اصلی مقصود ہے: عقائد و اعمال و اخلاق کا درست ہونا، جس کا حاصل :طلبِ رضائے حق ہے، آیا بلند نظری اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، اگر نہیں ہے تو اس کے لیے تعلیم قدیم میں کیا کوتاہی ہے؟ کیا جن افراد میں یہ اوصافِ حمیدہ پیدا ہوجاتے ہیں ان کو کوئی جزو تعلیم جدید کا بھی حاصل کرنا پڑتا ہے؟ یا بہت سے لوگ جو آج بزعم خود اپنے بلند نظر ہونے کا دعوی رکھتے ہیں اور اس کے لیے طریق جدیدہ ایجاد کرتے ہیں، انھوں نے اِس تعلیم قدیم کے سوا کچھ اور حاصل کیا ہے؟ یا اپنی حالت پر اِس مضمون کو صادق کر رہے ہیں:

کس نیاموخت علمِ تیر از من		کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

اور اگر بلند نظری کوئی اور چیز ہے تو نعوذ باللہ کیا حق تعالی (اور آپ کی معرفت) سے بھی زیادہ کوئی چیز بلند ہوسکتی ہے؟

آگے ایک لفظ ہے ''قوم کی بقاء''۔ یہ بھی محتاجِ شرح ہے، آیا مذہب کی بقاء کے علاوہ اس کا کچھ اور مفہوم ہے، یا اسی کی دوسری تعبیر ہے .... الخ

۵— فرماتے ہیں: ''یہ انتظام ضروری ہے کہ ایک معتد بہ جماعت ایسی بھی ہو جو ہر طرح علوم دینیہ میں کامل و محقق ہو، اور عمر کا بڑا حصہ ان علوم کی تحصیل میں، اور ساری عمر اُن کی خدمت و اشاعت میں صرف کرے، جس کے سوا اُن کا کوئی کام نہ ہو، قرآن مجید کی اس آیت

میں اسی کا ذکر ہے:(وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ) (آل عمران :۱۰۴)،اورحدیثوں میں اصحابِ صفہ کی یہی مثال ہے۔انتہی

چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ حدیث شریف میں اپنے خصوصی مقام وامتیاز کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: میرے مہاجر بھائی تو تجارت میں مشغول رہتے تھے، اور انصاری بھائی کاشت کاری اور کھیتی باڑی میں، جب کہ میں لوگوں کی طرف سے ملنے والے صدقات وعطیات پر قناعت کرکے، صفہ کے چبوترے پر پڑا رہتا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلنے والے ہر ہر لفظ کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔(بخاری :۱۱۸و۲۰۴۷،ومسلم :۲۴۹۲)

۶ـــ ’’اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اس وقت علوم دینیہ کے مدارس کا وجود مسلمانوں کے لیے ایسی بڑی نعمت ہے کہ اس سے فوق (بڑھ کر) متصور نہیں، دنیا میں اگر اسلام کے بقا کی کوئی صورت ہے تو یہ مدارس ہیں، کیوں کہ اسلام نام ہے خاص عقائد واعمال کا، جس میں دیانات، معاملات، معاشرت اور اخلاق سب داخل ہیں، اور ظاہر ہے کہ عمل موقوف ہے علم پر، اور علوم دینیہ کا بقا، ہر چند کہ فی نفسہ مدارس پر موقوف نہیں، مگر حالات ووقت کے اعتبار سے ضرور مدارس پر موقوف ہے‘‘(حقوق العلم ص ۸۴)۔

۷ـــ ’’میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ علماء: دنیا بھی سکھاتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ تاریخ اِس اَمر کی شہادت دے رہی کہ مسلمانوں کی دنیا، دین کے ساتھ درست ہوتی ہے، یعنی جب اُن کے دین میں ترقی ہوتی ہے تو دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے، اور جب دین میں کوتاہی ہوتی ہے تو دنیا بھی خراب ہوجاتی ہے، تو جب ہم دین سکھلاتے ہیں، معاملات، معاشرت، اخلاق کو درست کرتے ہیں تو گویا ہم دنیا کی ترقی کی تدابیر بھی بتلاتے ہیں‘‘۔(طریق النجاۃ۔عبدیت ج ۱۲،ص ۲۶)

۸ـــ ’’جیسے جیسے آزادی اور اِلحاد و بے دینی پھیلتی جا رہی ہے اسی طرح میرے خیال

میں مدارس دینیہ کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے‘‘ (حکیم الامت ص ۱۰۰)۔

۹ــ ’’مدارس اسلامیہ میں بے کار پڑے رہنا بھی انگریزی میں مشغول ہونے سے لاکھوں کروڑوں درجے بہتر ہے، اس لیے گولیاقت اور کمال حاصل نہ ہو،لیکن کم ازکم عقائد تو خراب نہ ہوں گے، اور مسجد کی جاروب کشی اُس وکالت اور بیرسٹری سے بہتر ہے جس سے ایمان متزلزل ہو، اور خدا ورسول اور بزرگان دین کی شان میں بے ادبی ہو، جو انگریزی کا اس زمانہ میں اکثری، بلکہ لازمی نتیجہ ہے، ہاں جس کو دین کے جانے کا غم نہیں وہ جو چاہے کرے‘‘۔(اقتباسات مذکورہ بحوالہ ’’العلم والعلماء‘‘ مرتبہ: مفتی محمد زید مظاہری)

۱۰ــ کتاب ’’حقوق العلم‘‘ میں ص ۱۶، آیت کریمہ: (**للفقراء الذين أحصروا في سبيل الله لا يستطيعون ضرباً في الأرض**) سے استنباط کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

’’.....اور اِس آیت سے علاوہ فائدۂ مذکورہ کے اور بھی چند فوائد معلوم ہوئے:

(الف) ایک یہ کہ ایسی جماعت کو ذرائعِ تحصیلِ معاش میں بالکل مشغول نہ ہونا چاہیے (**لا يستطيعون ضرباً في الأرض**) اس پر دلالت کررہا ہے۔اوراس سے یہ شبہ بھی جاتا رہا جو عوام الناس، علماء پر دنیوی معاش میں اپاہج ہونے کا الزام دیتے ہیں، اور ثابت ہوگیا کہ بایں معنی اپاہج ہونا ضروری ہے، اور راز اِس میں یہ ہے کہ ایک شخص سے دو کام ہوا نہیں کرتے، خصوصاً جب کہ ایک کام ایسا ہو کہ ہر وقت اس میں مشغول ہونے کی ضرورت ہو: بالید، یا باللسان، یا بالقلب۔ اور خدمتِ دین ایسا ہی کام ہے، اور تدریسِ علومِ دینیہ یہ ذرائعِ معاش میں داخل نہیں، بلکہ وہ تنخواہ بوجہ خدمتِ دین میں محبوس ہونے کے ہے، مگر تعیین کے ساتھ ہے، اور تعیین مصلحتِ قطعِ نزاع کے لیے ہے۔

(ب) ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کسی دنیا دار کے سامنے اپنی حاجت پیش نہ کرنا چاہیے، بلکہ اغنیاء کی طرح مستغنی رہیں۔

(ج) ایک یہ کہ اموال کا سوال کسی سے نہ کرے، (**لا يسألون الناس إلحافاً**) اس پر دال ہے۔ چندہ کی ترغیب اس میں داخل نہیں، وہ دعوت الی الخیر ہے۔

(د) ایک یہ کہ گو وہ سوال نہ کریں، مگر دوسروں کو چاہیے کہ اس کا تجسس رکھیں، اور فراست وقرائن سے پہچان کران کی خدمت کریں۔

(ھ) ایک یہ کہ ان کی خدمت کر کے احسان نہ رکھیں، کیوں کہ وہ اپنے نفع کے لیے ہے''۔

۱۱— ''میں علماء کے میدان میں آنے کا من کل وجہٍ مخالف نہیں، بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ سب کو میدان میں نکلنا جائز نہیں، ہاں جب علماء علم دین کو اچھی طرح حاصل کرلیں تو جن کو میدان میں نکلنے کا شوق ہو وہ آئیں۔

مگر کچھ لوگ حجرہ نشین بھی ہونے چاہئیں، جن کا کام سوائے قال اللہ وقال الرسول اور سوائے کتابیں پڑھنے پڑھانے کے کچھ نہ ہو، کیوں کہ تجربہ یہ ہے کہ کتابی استعداد اور فتوی دینے کی قابلیت بدون اس کے کامل نہیں ہوتی، جو علماء میدان میں آئے ہوتے ہیں اُن میں اکثر تو وہ ہیں جن کی کتابی استعداد بالکل نہیں، اور اگر کسی کو یہ قابلیت حاصل ہو تو یہ حجرہ نشینی ہی کی برکت ہے، کہ وہ ایک مدت تک حجرہ نشین ہو کر کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا ہے۔

مگر آپ اس حجرے ہی کو بند کرنا چاہتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند روز میں قرآن وحدیث اور فقہ کو سمجھنے والے اور اُن کو صحیح طور پر حل کرنے والے دنیا سے ناپید ہو جائیں گے، اگر اس کی ضرورت کو آپ محسوس کرتے ہیں اور یقیناً ہر شخص اس کی ضرورت کو تسلیم کرے گا، تو ضروری ہے کہ سب علماء میدان میں نہ آئیں، کچھ میدان میں آئیں، اور کچھ مناظرہ کریں، کچھ تبلیغ کریں.....۔

۱۲— ''..... اور ایک جماعت ایسی ہو کہ جو ان سب کاموں سے الگ ہو کر قرآن وحدیث وفقہ اور ضروریات (دین) کی تعلیم دیں، ان کو سوائے تعلیم وتعلم کے کچھ نہ کرنا چاہیے، ورنہ قابل علماء ہرگز نہ پیدا ہوں گے، تقسیمِ خدمات بہت ضروری ہے، اور تمام عقلاء اور متمدن اقوام اس کی ضرورت پر متفق ہیں، پھر حیرت ہے کہ ہمارے بھائی اس کو نظرانداز کر کے، سب کو ایک کام میں کیوں لگانا چاہتے ہیں۔

بس علماء کا جو کام ہے جس کا انھوں نے بیڑا اُٹھایا ہے وہ اس کو بحمد اللہ بخوبی کر رہے

ہیں، آپ کو ان کے کام میں دخل دینے کی ضرورت نہیں''۔

۱۳— ''فرمایا: اب تو یہ حالت ہے، اور اسی کی فکر ہے کہ میدان میں آنا چاہیے، میدان میں آنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حجرہ بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے، اور میدان بھی ہاتھ نہیں آتا، پھر ان لوگوں کے نزدیک میدان میں آنے کی نہ کچھ شرائط ہیں نہ حدود ہیں، یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ زبانوں پر یہ آتا ہے کہ مسائل کا وقت نہیں، کام کا وقت ہے، کام کرنا چاہیے۔

سخت افسوس ہے کہ بعضوں کی تو یہاں تک نوبت آ گئی ہے کہ علمِ دین میں مشغول ہونے کو فضول اور بے کار سمجھتے ہیں، نا معلوم یہ سبق کہاں سے حاصل کیا ہے؟ یورپ میں بھی تو یہ طریق نہیں، .... ہوش سے کام کرنے کی ضرورت ہے، جوش سے اول تو کام نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے''۔

۱۴— ''اگر حدود سے گذر کر ترقی کی جائے تو وہ ایسی ہوگی جیسے فرعون نے ترقی کی تھی، تو ایسی ترقی سے ایک مسلمان ایمان والے کو کیا فائدہ؟ ایسی ترقی مسلمانوں کی ترقی کے قابل کب ہوگی؟ یقیناً کفار کی ترقی کہلائے گی، مسلمانوں کے لیے ایسی ترقی میں کون سی خوبی ہوگی؟ ان کی خوبی تو ایسی ترقی میں ہے کہ حدود کا تحفظ ہو، اور پھر ترقی ہو، یہ خوبی کی بات ہے۔ (مذکورہ اقتباسات از حواشی ''حقوق العلم'' جدید طباعت)

ہر زمانے کے معاصر علوم وفنون (**وعلم آدم الأسماء كلها**) کے تحت ''آدمیوں'' کی ایک معاشرتی ضرورت ہیں، نہ ان کی اہمیت وافادیت کا انکار کیا جا سکتا ہے، نہ ان کے مطلوب وضروری ہونے کا، اور یہ سلسلہ ہر زمانے میں بغیر کسی شور اور ہنگامے کے جاری بھی رہا ہے، آخر آج سے پہلے بھی طب، معالجہ، تجارت، زراعت، اور دیگر حرفت وصنعت وغیرہ سائنسی اور معاشرتی علوم وفنون پائے جاتے تھے یا نہیں؟ اور کیا کبھی کسی عالم دین نے ان کی ضرورت واہمیت کا انکار کیا ہے؟

مگر پریشانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس عام معاشرتی ضرورت کے نصاب ونظام کو دینی مدارس کا حریف، یا ان کے نصاب ونظام کا حصہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالاں کہ نہ تو یہ علوم وفنون ہمارے مدارس کے حریف ہیں، کہ ان کو مدارس کا مدمقابل بنا کر پیش کیا جائے، جیسا کہ دین بیزار طبقات کرتے ہیں، اور نہ ہی یہ ہمارے نصاب ونظام کا جزو ہیں، جیسا کہ آج کل بعض اپنے حضرات کی تقریر وتحریر سے بھی اس کا اِیہام ہوتا ہے۔

بلکہ یہ عام انسانوں کی عام ضرورتوں سے متعلق فنون ہیں، جو جس فن کو جتنا سیکھنا چاہے (اپنے عقیدہ وعمل کی ضمانت کے ساتھ) سیکھے، اور رہے ہمارے مدارس تو یہ دنیا کی آمیزش کے بغیر ''خالص دینی'' ادارے ہیں، حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''مدرسہ دیوبند کی تعلیم کی بابت بڑے بڑے انگریزوں کی یہ تحریر ہے کہ اگر اِس مدرسہ کی مذہبی تعلیم میں دنیاوی تعلیم شامل کی گئی، تو اِس کا مذہبی خالص رنگ باقی نہ رہے گا، جو اِس مدرسہ کا مایۂ ناز ہے'' (ملفوظات ۱۸/ ۲۳۳)۔

دارالعلوم دیوبند کے اولین صدرالمدرسین حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد ہے: ''اکثر لوگوں کو اس مدرسے کی حالت دیکھ کر خیال ہوگا کہ یہاں علوم معاش کا کچھ انتظام نہیں، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مدرسہ اس لیے ہے ہی نہیں، نہ ہم نے دعوی کیا ہے کہ تمام علوم کی تعلیم ہوگی، یہ تو صرف ان کے لیے ہے جن کو فکرِ آخرت نے دیوانہ بنایا ہے''۔ (حسن العزیز ۲/ ۱۳۹)۔

خلاصہ یہ کہ ایک ہے ''علمِ نبوت''، اور ایک ہے ''علمِ آدمیت''، ہمارے اِن مدارس کا اَصل موضوع ''علمِ نبوت'' ہے، ''علمِ آدمیت'' نہیں، انبیائے کرام علیہم السلام کا مقصدِ بعثت، اور موضوعِ دعوت، معاشرے میں رائج علوم وفنون حاصل کرکے، ''تمدنی ترقی'' کی دوڑ میں شامل ہونا نہیں ہوتا، بلکہ جو لوگ پہلے سے اِن اُمور میں مشغول ہوتے ہیں اُن کے اندر، دنیا میں انہماک کم کرکے، تعلق مع اللہ، اور فکرِ آخرت کا جذبہ پیدا کرنا ہوتا ہے، اور ہر چیز میں حلال وحرام کی تفصیل بتلا کر، حدودِ شریعت قائم فرمانا ہوتا ہے۔

علمِ نبوت اور علمِ آدمیت کا یہی وہ فرق ہے جو اِن دونوں حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے، کہ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (أعلمكم بالله أنا)، اور دوسرے موقع پر آپ ہی کا ارشاد ہے: (أنتم أعلم بأمر دنياكم)۔

البتہ جو معاصر علوم وفنون: دین فہمی، اشاعتِ دین، یا دفاعِ دین میں مفید ومعاوِن ہوسکتے ہیں، اُن کو بھی حسبِ مصلحت اور بقدرِ ضرورت اُن چند شرائط کے ساتھ دینی مدارس کے نصاب ونظام کا حصہ بنایا جاسکتا ہے، جو حضرت تھانویؒ نے تعلیمِ انگریزی سے متعلق ایک استفتاء کے جواب میں ذکر فرمائی ہیں۔

''رسالہ ''تحقیقِ تعلیمِ انگریزی'' میں مفصل جواب لکھا ہے، مختصر یہ ہے کہ انگریزی مثل اور زبانوں کے ایک مباح زبان ہے، مگر تین عوارض سے اس میں خرابی آجاتی ہے:

اول: بعض علوم اس میں ایسے ہیں جو شریعت کے خلاف ہیں، اور علمِ شریعت سے واقفیت ہوتی نہیں، اِس لیے عقائد خراب ہوجاتے ہیں، جس میں بعض عقائد قریبِ کفر، بلکہ کفر ہیں۔

دوسرے: اگر ایسے علوم کی بھی نوبت نہ آئے، تو اکثر صحبت بد دینوں کی رہتی ہے، ان کی بد دینی کا اثر اس شخص پر آجاتا ہے، کبھی اعتقاداً، جس کا حکم اوپر معلوم ہو چکا، کبھی عملاً، جس سے نوبت فسق کی آجاتی ہے۔

تیسرے: اگر صحبت بھی خراب نہ ہو، یا وہ مؤثر نہ ہو، تو کم از کم اتنا ضرور ہے کہ یہ نیت رہتی ہے کہ اس کو ذریعۂ معاش بناویں گے، خواہ طریقۂ معاش حلال ہو یا حرام، اور یہ مسئلہ عقلاً ونقلاً ثابت ہے کہ جو مباح: ذریعہ کسی حرام کا بن جائے وہ حرام ہوجاتا ہے۔

پھر ایسا عزم خود معاصیٔ قلب سے ہے، تو اِس صورت میں فسقِ ظاہری کے ساتھ فسقِ باطنی بھی ہے۔

اِن عوارض ثلاثہ کی وجہ سے گاہے کفر و اِلحاد تک، گاہے فسقِ ظاہری تک، گاہے صرف فسقِ باطنی تک، نوبت پہنچ جاتی ہے۔

اگر کوئی اِن عوارض سے مبرا ہو: (۱) یعنی عقائد بھی خراب نہ ہوں، جس کا آسان

طریقہ، بلکہ متعین طریقہ یہی ہے کہ علمِ دین حاصل کرکے، یقین کے ساتھ اُس کا اعتقاد رکھے، (۲) اور اَعمال بھی خراب نہ ہوں، (۳) عزم بھی یہ رہے کہ اِس سے وہی معاش حاصل کریں گے جو شرعاً جائز ہوگی، اور پھر اسی کے موافق عمل درآمد بھی کرے:

تو ایسے شخص کے لیے انگریزی مباح اور درست ہے، اور اگر اس سے بڑھ کر یہ قصد ہو کہ اُس کو ذریعۂ خدمتِ دین بناویں گے تو اس کے لیے عبادت ہوگی۔

حاصل یہ کہ انگریزی کبھی حرام ہے، کبھی مباح، کبھی عبادت''۔(امدادالفتاوی ۱۵۶/۶)۔

یہاں ایک اہم سوال یہ کیا جاتا ہے کہ جب یونانی فلسفہ آیا تھا، تو وہ بھی کفریہ عقائد اور اِلحاد ہی پر مشتمل تھا، مگر اِس کے باوجود ہمارے اکابر نے اُس کو حاصل کرکے، مفاسد کو دور کیا، اور پوری بصیرت کے ساتھ حق اور ناحق کو ایک دوسرے سے ممتاز کیا، تو جس طرح سے ہمارے اسلاف نے اُس کو بالکلیہ رد کرنے کے بجائے، مفید و مضر پہلوؤں کو ایک دوسرے سے علاحدہ کیا تھا، اِسی طرح سے اکابر دیوبند وسہارنپور کو بھی چاہیے تھا کہ سائنس وغیرہ جدید علوم حاصل کرتے، پھر اُس کے حق و باطل میں خط امتیاز کھینچتے، تاکہ قوم دینی حیثیت سے اُن کے مضر پہلوؤں سے بچ جاتی، اور دنیوی فوائد حاصل کرلیتی۔

اِس کے جواب میں چند نکتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

اول: فلسفہ وغیرہ علوم خیر القرون کے بعد، مسلمانوں کے ہاں آئے ہیں، اِس لیے اُس زمانے کے کسی بھی عمل کو بطور حجت اور معیارِ حق کے نہیں پیش کیا جاسکتا۔

دوم: دوسری بات یہ ہے کہ جب اسلامی معاشرے میں یہ علوم آئے تھے، تو عقائد ہی کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے اُس وقت کے بھی دینی حلقوں کی طرف سے ان کی شدید مخالفت کی گئی تھی، پھر یہ علوم معاشرتی ضرورتوں کے تحت اگرچہ مسلمانوں میں داخل ہوتے چلے گئے تھے، مگر جو لوگ اِس میں منہمک ہوئے، وہ عام طور پر اپنے عقائد کی حفاظت نہ کرسکے، چنانچہ بوعلی سینا، فارابی، کندی، زہراوی وغیرہ جتنے مسلمان سائنس دانوں کے نام

لیے جاتے ہیں اُن کی شخصیات دینی لحاظ سے کافی مطعون رہی ہیں۔

سوم: تیسری اہم بات یہ ہے کہ اُس وقت مسلمان عروج پر تھے، اور دوسروں سے متاثر ہونے کے بجائے، خود مؤثر اور اثر انداز تھے، اسلامی تہذیب ومعاشرت پوری دنیا کے لیے نمونہ تھی، تو اگر وہ دوسروں کی چیز استعمال کر بھی رہے تھے، تو مرعوب ہو کر نہیں، صرف معاشرتی اور تمدنی ضرورت کے تحت۔

مگر اَب صورتحال بدلی ہوئی ہے، امت مسلمہ فکر وعقیدہ کے اعتبار سے جاں بلب ہوچکی ہے، اَب مسلمان اپنی شامتِ اعمال سے زوال وانحطاط کا شکار ہیں، اُن کی اپنی تہذیب وثقافت، اور اخلاق ومعاشرت کا کوئی معیار باقی نہیں رہ گیا ہے، وہ خود دوسروں سے مرعوب ہیں، دوسروں کی تہذیب وثقافت اور اخلاق ومعاشرت کو نعوذ باللہ اپنے لیے نمونہ اور معیار سمجھنے لگے ہیں، اور اِس کے لیے سب سے بڑا ذریعہ غیروں کی زبان، اُن کی تعلیم، اور (مزعومہ) سائنسی ترقیات ہیں، اِس لیے ایسی مرعوبیت کی حالت میں ان چیزوں کی طرف جھانک کر دیکھنا بھی انتہائی خطرناک ہوسکتا ہے، جاں بلب مریض کو انتہائی نگہداشت (آئی، سی، یو) میں ہی رکھا جاتا ہے، باہر کی فضائی آلودگی اس کے لیے کس قدر مہلک ہے، یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں۔

یہ کتنی عبرت کی بات ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے دور سے اَب تک جن حضرات نے بھی ''جدید اُسلوب'' میں اہل باطل کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی نیک نیتی کے باوجود وہ حضرات فکری لحاظ سے ''تجدد'' کی کم از کم آنچ اور دھویں سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے (الا ماشاء اللہ)۔

کسی نے غیب کا انکار یا استہزاء کیا، کسی نے نصوص شرعیہ سے چھیڑ چھاڑ کی، کسی نے معجزات کا انکار یا بے جا تاویلات کیں، کسی نے اسلامی سادگی اور بے تکلفی پر تبصرے کیے، کسی نے سلف کو مطعون کیا، کسی نے صحابہ پر تنقید کی، کسی نے فقہ کا مذاق اڑایا، کسی نے تصوف اور تقلید کو نشانہ بنایا..... وغیرہ وغیرہ، یہ سب چیزیں ''جدت پسندی'' (انگریزی تعلیم وتہذیب، اور سائنسی مزاج) کے لازمی نتائج میں سے ہیں۔

ایسے میں اگر اکابر دیوبند وسہارنپور ''جدید دور کے جدید تقاضوں'' کے خوش نما عنوان سے خدانخواستہ ذرا بھی متاثر ہوگئے ہوتے، جیسا کہ دیگر حلقے چاہتے تھے، اور اس کے لیے پورا زور صرف کررہے تھے، تو اِسلام کو اُس کی اصل شکل میں برتنے والے شاید انگلیوں پر بھی پورے نہ ہو پاتے، مگر بتوفیقہ تعالی دینی مدارس کے اپنے ''فرسودہ نصاب ونظام'' پر جمود (یا استقامت) نے اہل باطل کی ساری کوششیں ناکام بنادیں، اور الحمد للہ مسلمانوں کی زندگیوں میں وہی دین پوری قوت اور تازگی کے ساتھ باقی رہ گیا جو اَب سے چودہ سو تیس سال قبل مکمل ہوچکا تھا، اُس میں نہ کسی سائنسی تحقیق سے استفادے کی ضرورت پڑی، نہ کسی جدید تہذیب وثقافت کے اضافے کی (جیسا کہ ایک صاحب نے اسلام میں ''تدریج'' کی بات کہی ہے، نعوذ باللہ)، نہ کسی نئی زبان کی تعلیم کی، اور نہ رفتارِ زمانہ کا ساتھ دینے کی۔ **فللّٰه الحمد، وله الشكر۔ ''الحمد لله الذي هدانا لهذا وما كنا لنهتدي لو لا أن هدانا الله''**

بہت سے حضرات کے ہاں ایک بڑی غلط فہمی اور تاریخی خلط پایا جاتا ہے کہ ''ہمارے اِن مدارس کی اصل: جامعہ قرویین، یا جامعہ ازہر، یا بغداد وقرطبہ کی درسگاہیں ہیں''۔

حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اِن مدارس کا اصل سلسلۂ نسب ''دارِ اَرقم'' اور ''صفہ'' کے مدرسوں اور ''خیر القرون'' کی اُن درسگاہوں سے ملتا ہے، جہاں نہ یونان کا فلسفہ تھا، نہ یورپ کی سائنس، نہ اِیران کی مادی ترقیات موضوعِ بحث تھیں، اور نہ روم کی قوت وشوکت۔

بلکہ وہاں کے اصل موضوعات: تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب، تلقینِ حکمت (آدابِ زندگی)، تزکیۂ نفوس، تطہیرِ قلوب، دعوت الی اللہ، تبلیغِ اَحکام، تحلیلِ حلال، تحریمِ حرام اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر وغیرہ شرعی اُمور تھے، ان مدارس میں نہ تو میڈیکل کالج تھا، نہ انجینئرنگ کالج، نہ سائنس فیکلٹی تھی، نہ ٹیکنالوجی کا کوئی سلسلہ۔

تو دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور اور ان کے مبارک سلسلے کے مدارس ومکاتب کے نصاب ونظام کی اصل (**الإسلام بدأ غريباً، وسيعود كما بدأ غريباً، فطوبى للغرباء** کے پیش نظر) ''خیر القرون'' کی اِن درسگاہوں میں، پھر کوفہ میں امام ابو حنیفہ، مدینہ منورہ میں امام مالک، مصر میں امام شافعی، بغداد میں امام احمد اور اسی طرح عالمِ اسلام کے دیگر فقہاء، محدثین، اور صوفیہ رحمہم اللہ کے مدرسوں میں تلاش کرنا چاہیے۔

قرویین وقرطبہ وغیرہ کی درسگاہیں: ایک تو خیر القرون کے بعد کی مثالیں ہیں۔

دوسرے وہ ایک خود مختار اسلامی حکومت کی دینی اور دنیاوی دونوں ضرورتوں کے پیش نظر، انہی حکومتوں کی سرپرستی میں تھیں۔

تیسرے: دین کی اس کی اصل شکل میں حفاظت کا مدار صرف انہی پر نہیں تھا، بلکہ فلسفہ وسائنس اور دیگر دنیوی فنون کی تعلیم سے یکسو؛ ہر زمانے اور ہر علاقے میں ایسے تعلیمی سلسلے موجود رہتے تھے، جن کا موضوع صرف اور صرف ''قال اللہ وقال الرسول'' ہوتا تھا۔

جب کہ اِس زمانے میں پوری دنیا میں (بالعموم، الا ما شاء اللہ) سوائے دینی مدارس کے نصاب کے، خالص دینی علوم کی حفاظت واشاعت کے مدرسے اور سلسلے باقی نہیں رہ گئے، ایسے میں اس نظام میں کسی اور طرح کی آمیزش انتہائی خطرناک اور مضر ہوسکتی ہے۔

جب تک ریاستی پیمانے پر اِسلام کی اُس کی اصل شکل میں حفاظت کی ضمانت کا کوئی معقول ومعتمد انتظام نہ ہوجائے، جب تک دین ودنیا کا اختلاط وامتزاج، ہمارے اکابر کے نزدیک، مدارس اسلامیہ کے اصل مقاصد کے اعتبار سے، باعثِ نفع ہونے سے زیادہ، موجبِ ضرر ہے۔

شیخ الحدیث حضرت شیخ زکریا علیہ الرحمۃ نے ''آپ بیتی'' ۱/ ۲۰۷ تا ۲۱۳ میں اِس موضوع پر نہایت اہتمام سے گفتگو فرمائی ہے، اور اِن دینی مدارس کے لیے مضر چیزیں

نہایت تفصیل کے ساتھ شمار کرائی ہیں، جن میں: نصاب کی تبدیلی، تعلیمِ انگریزی و ہندی، اخبار بینی، جلسہ بازی، مجلس سازی اور حرفت وصنعت وغیرہ کا بطور خاص ذکر آیا ہے، جو قابلِ ملاحظہ ہے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی کیا جاتا ہے کہ جب اہل مدارس صرف ''حفاظتِ دین'' کی ذمہ داری لے کر، اپنے مدرسوں میں یکسو ہوجائیں گے تو قوم کے اُن باقی ۹۶/۹۵ فی صد بچوں کے دین وعقیدے کا کیا ہوگا، جن کے لیے اپنی اور اپنی قوم دونوں کی، معاشی اور معاشرتی ضرورتوں کے تحت، دنیاوی تعلیم کا حاصل کرنا ناگزیر ہے، وہ مدرسوں کے موجودہ نصاب ونظام میں شامل نہیں ہوسکتے، اور اہل مدارس اُن کی دینی وتعلیم وتربیت کا کوئی دوسرا معقول بندوبست کرتے نہیں، تو ان کے دینی مستقبل کا کیا ہوگا؟

یہ سوال بہت اہم اور حساس ہے، مگر مذکورہ بالا تفصیلات کی روشنی میں اس کا جواب بھی بہت واضح ہے، وہ یہ کہ علمائے کرام کی اصل اور بنیادی ذمہ داری تو صحیح شرعی اصول کے مطابق لوگوں کے دین کی حفاظت ہے، جس کے لیے ہر ہر گاؤں اور بستی، بلکہ ہر ہر مسجد میں مکاتب کا قیام، اور بچوں کی (معیاری) دینی تعلیم کا نظم کرنا، اُن کا فرض منصبی ہے، اور آگے قوم کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اُن مکاتب اور مساجد میں داخل کرائیں، اور ان کے دین وعقیدے کی اور نجاتِ آخرت کی فکر کریں۔

اَب اگر علماء (بحیثیتِ مجموعی) اپنے اِس فرضِ منصبی میں کوتاہی کر رہے ہیں، اور ہر علاقے میں پہنچ کر نونہالانِ امت کے لیے مکاتب کا قیام نہیں کر پارہے ہیں، اور ان کی معیاری دینی تعلیم وتربیت کا بندوبست نہیں کر پارہے ہیں، تو یہ یقیناً کوتاہی ہے، اور قابلِ اصلاح ہے۔

مگر اعتراض اِس پہلو سے کرنا کہ جب قوم کے بچے ''دینی مکاتب'' میں آتے نہیں، تو

پھر علماء کو ''نرسری اسکول'' اور ''انگلش میڈیم اسکول'' کھول لینا چاہیے، اور ''مشنریوں'' کے طریقے پر بچوں کی تعلیم کا نظم کرنا چاہیے، یہ کسی بھی طرح درست نہیں۔

ہم کسی بھی دینی، تبلیغی اور اصلاحی کام کو شریعت، دینی اصول اور اسلامی طریقے کے مطابق کرنے کے پابند ہیں، مطلق کام مقصود نہیں ہے، بلکہ شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے، علماء (اور مکاتب ومدارس کے اساتذہ) سے یہ شکایت تو بجا ہوسکتی ہے کہ وہ دینی تعلیم اُس کے مطلوبہ معیار پر نہیں دے رہے ہیں، مگر اِس کوتاہی پر یہ ردعمل کہ اس کو چھوڑ کر، غیروں کی تعلیم دینے لگ جائیں، یا نعوذ باللہ ان کی تہذیب اور طریقہ اختیار کرلیں، یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔

اُمت کے اِس اہم اجتماعی مسئلے کا درست حل یہ ہے کہ اہل علم (اور حفاظ ومدرسین) تو اپنی اپنی حیثیتوں اور دائرۂ کار کے اعتبار سے، خالص معیاری دینی تعلیم کی فکر فرمائیں، اور قوم کے دیگر ہمدرد اور فکرمند حضرات آگے بڑھ کر، بچوں کے لیے ایسے دنیاوی ادارے قائم فرمائیں جن میں عقیدہ وعمل کی حفاظت کی ضمانت ہو۔

وہ اہل علم جن کو دینی مقتدا کی حیثیت حاصل ہے، وہ مشائخِ عظام، مفتیانِ کرام، ائمۂ مساجد، اور مدرسینِ مکاتب جن پر قوم کی دینی رہنمائی کی ذمہ داری ہے، وہ ایسے اداروں کے براہ راست منتظم نہ بنیں، اِس لیے کہ تجربہ یہی ہے کہ ایسے اِداروں میں کچھ ایسے اُمور کا اِرتکاب کرنا پڑتا ہے جو شرعاً ممنوع، ناپسندیدہ اور دینی ثقاہت ومروت کے خلاف ہوتے ہیں، ''ثقہ'' قسم کے لوگوں کے شایان شان نہیں ہوتے، جب کہ ہمارے ہاں یہ اُصول مسلمات میں سے ہے کہ دِین: ''ثقہ'' اور ''مستند'' لوگوں سے ہی حاصل کیا جائے۔

اِس لیے یہ حضرات براہِ راست تو اِس طرح کا کام حتی الامکان نہ کریں، ہاں اِن حضرات کی روحانی سرپرستی، علمی وعملی مشورے اور شرعی رہنمائی کے ساتھ، قوم کے دیگر

حضرات: ملت کی اِس اہم ترین معاشی ومعاشرتی ضرورت کی تکمیل کے لیے کھڑے ہوں۔

حاصل یہ کہ اِن بچوں کے دین کی حفاظت کی فکر، مدارس سے الگ نصاب ونظام قائم کر کے بھی کی جاسکتی ہے، اس میں نہ مدارس کو چھیڑنے کی ضرورت ہے، اور نہ ان پر اس پس منظر میں کسی تنقید وتبصرے کی۔

اِن معروضات کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے اِن مدارس میں کسی طرح کی اصلاح وتجدید کی ضرورت نہیں ہے، یہ ہر طرح کی تنقید اور محاسبہ سے بالاتر ہیں، ہرگز نہیں، اِس وقت تو مدارس کو اپنے نصاب ونظام، اور طریقۂ تعلیم وتربیت کے سلسلے میں فوری طور پر از خود سخت محاسبے اور اصلاح کی ضرورت ہے، مگر اس میں تجدید کی جائے، کہ اُن کو عام طلبہ کی ذہنی سطح کی رعایتوں کے ساتھ، ان کے اصل خالص علمی، عملی، تعلیمی، تربیتی اور روحانی نظام پر واپس لے جایا جائے، تجدد نہیں، کہ موجودہ شور ہنگاموں سے مرعوب ومتاثر ہو کر، مادی ذرائع اختیار کر کے، اُن کی روح ہی نکال دی جائے۔

واللہ الموفق وهو المستعان، ولا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم، وصلى الله تعالٰى على خير خلقه محمد وآله وصحبه أجمعين وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔